Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2025; Vol 04 (Issue 02)
P. 11-21 https://journals.gscwu.edu.pk/

زنیرہ صدیق

پی ایچ ڈی اسکالر، دی ویمن یونی ورسٹی ملتان

ڈاکٹر عذرا پروین

چیئر پرسن شعبہ اردو، دی ویمن یونی ورسٹی ملتان

Zunaira Siddique

Ph.D. Scholar the Woman University Multan.

Dr. Azra Parveen

Chair Person, Department of Urdu, the Woman University Multan.

انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" اور خالد جاوید کے ناول "موت کی کتاب" میں وجودی عناصر کا تقابلی جائزہ

A Comparative Study of Existential Elements in Anees Nagi's *"Deewar ke Peechay"* and Khalid Javed's *"Mout ki Kitab"*

Abstract:

This study presents a comparative analysis of existential elements in Anees Nagi's *Deewar ke Peechay* and Khalid Javed's *Mout ki Kitab*, two significant works of modern Urdu literature that reflect profound philosophical and psychological concerns of the contemporary individual. Drawing upon existentialist thought—particularly themes of alienation, absurdity, anxiety, death, and the crisis of meaning—the research examines how both writers articulate human existence in a fragmented and oppressive social reality. Anees Nagi's *Deewar ke Peechay* portrays existential confinement through symbolic barriers, highlighting the individual's struggle against social norms, inner emptiness, and the loss of authentic selfhood. In contrast, Khalid Javed's *Mout ki Kitab* intensifies existential despair by focusing on death, decay, and corporeal reality, presenting existence as a continuous confrontation with meaninglessness and mortality. While Nagi's narrative leans toward intellectual abstraction and symbolic resistance, Khalid Javed adopts a stark, grotesque realism to expose existential anxiety. The study argues that despite differences in narrative style and thematic

emphasis, both texts converge in depicting the modern human condition as deeply alienated and psychologically fractured. By comparing these works, the paper highlights their shared contribution to existential discourse in Urdu fiction and underscores their relevance to understanding modern existential consciousness.

Keywords: Existentialism, Urdu Fiction, Anis Nagi, Khalid Javed, Alienation, Absurdity, Death.

علم اور نظری فلسفے میں تاریخ اور انسانیت سے متعلق تمام تر مباحث کو مشرقی اور مغربی دونوں کی قائم کردہ تنقید میں دیکھنے کی بجائے اسے عہد در عہد جب دیکھا جاتا ہے تو اس کی معنویت میں دلچسپی مزید بڑھ جاتی ہے۔ انسان شروع سے اپنی جستجو کے سفر میں گامزن رہا ہے۔ علم و ادب میں علم فلسفہ ، جس کو کئی علوم کی ماں کہا جاتا ہے میں بہت سے فلسفوں نے جنم لیا جنھوں نے انسانی زندگی کے جینے کے ڈھنگ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ انھیں فلسفوں میں ایک فلسفہ وجودیت بھی ہے۔ اس فلسفے نے انسانی وجود کے متعلق اپنے نظریات کو پیش کیا۔ انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی رہا ہے کہ انسان ایک اکائی ہونے کے باوجود ہمیشہ سے پراسرار حقیقت بنا رہا ہے۔ اس فلسفے نے اسی انسانی وجود کے المیہ پر بات کی ہے۔

انسانی وجود نے ہمیشہ سے اپنا آپ تلاش کرنے کے لیے کئی ایک مفروضے قائم کیے جو کہ تہذیبی دائرے میں کبھی تو معنی کی حیثیت رکھتے ہیں اور کبھی انہیں رد کر دیا جاتا ہے۔ اس فلسفے کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ کائنات کا عقلی مقصد ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس فلسفے میں ان لوگوں کا ماننا ہے کہ فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے جینے کا مقصد خود ڈھونڈ کر اس میں سے اپنی مطلب کی چیزیں نکال کر اپنی مرضی سے زندگی بسر کرے۔ اسی لیے اس فلسفے کو باقی تمام فلسفوں میں ایک الگ مقام حاصل ہے۔ وجودیت کو عالمی سطح پر جن مفکرین نے متعارف کروایا ان کے نام یہ ہیں: سورین کرکیگارڈ، فریڈک نطشے، جین پال سارتر، کارل جیسپر اور البرٹ کامیو۔ وجودیت کے یہ تمام فلسفی، انسانی وجود کو بنیادی موضوع کے طور پر زیر بحث لاتے ہیں۔ اس فلسفے کا بانی سویرین کرکیگارڈ کو مانا جاتا ہے۔

سویرین کرکیگارڈ (1813–1855) نے اپنی کتابوں Fear and Trembling اور The Sickness unto Death میں فلسفہ وجودیت پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک اس دنیا کی اصل حقیقت وہ ہے جو فرد اپنے تجربات سے سیکھتا یا محسوس کرتا ہے۔ انگریزی زبان میں وجودیت کے لیے لفظ Existence استعمال ہوا ہے۔ جب فلسفہ وجود پر بات کی جاتی ہے تو سب سے پہلا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وجودیت یا وجود کیا ہے؟ نظریہ وجودیت کے متعلق کرکیگارڈ لکھتے ہیں:

"subjectivity is truth subjectivity is reality." (1)

اگر اس فلسے کو مد نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ ایک انسان کی ساری اہمیت اس کے وجود سے جڑی ہے۔ کرکیگارڈ کا ماننا ہے کہ انسان اپنے وجود کی تلاش اپنے داخل سے کر سکتا ہے نا کہ خارج میں رہ کر۔ فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے جذبات اور احساسات کو سامنے رکھ کر اپنی ذات کی پہچان کرے نا کہ عقلی دلائل اور سائنسی یا منطق سے سمجھے۔ یہی بات ان کے فلسفے کی جان ہے۔ جے اے کوڈن وجودیت کی تعریف کچھ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "The learn of "Existentialism" means "pertaining" to Existence or in logic predicating Existence." Philosophically , it now applies to a vision of the conditions and existence of man, his place and function in the world, and his relationship or lack of one with God".(2)

اس اقتباس میں جے۔اے کوڈن نے انسان کی انفرادیت اور اس کی شخصی حالت اور آزادی رائے پر بات کی ہے۔ ساتھ ہی وہ سوال بھی اٹھاتا ہے کہ انسان کی تخلیق کی وجہ کیا ہے؟ اس کو سوچ سمجھ کر تخلیق کیا گیا ہے؟ یا اس کی تخلیق کوئی حادثہ تھی؟ فلسفہ وجودیت کے ماننے والوں کا کہنا ہے کہ انسان آزاد ہے۔ فلسفہ وجود باقی تمام فلسفوں کو رد کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان دنیا کی اولین اور افضل ترین مخلوقات میں سے ایک ہے۔ یہ لفظ انفرادیت فرد کے لیے بھی مختص ہے جو اپنی تخلیقی شناخت میں بے مثل ہے۔ڈاکٹر احسان اشرف اپنی کتاب" فلسفہ وجودیت" میں لکھتے ہیں

> "وجود کا تصور ہی وجود ی انداز فکر کی بنیادی خصوصیت ہے۔یہ فلسفہ انسان سے شروع ہوتا ہے لیکن ایک فکر کرنے والی ذات سے نہیں بلکہ ایک وجود کے پیکر کی حیثیت سے انسان کا پہلے وجود ہے اس کے بعد ہی فکر و عمل ہے۔ جدید فلسفہ کے بانی ڈیکارٹ کا مقولہ ہے،" میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں، کے برعکس وجودی مفکرین کا ماننا ہے کہ میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں۔"(3)

ژاں پال سارتر بھی وجود ی فلسفے کا حامی ہے۔ سارتر خود کو وجودی کہلانا پسند کرتا ہے۔ سارتر کے مطابق ہر فرد اپنی زندگی میں آزاد اور با اختیار ہے۔ اس بات کو بھی مانتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز اپنا وجود اور شناخت رکھتی ہے لیکن انسان ان سب میں افضل ترین مخلوق ہے۔ اپنی اس بات کو سارتر اس طرح واضح کرتا ہے۔

> "نباتات اور حیوانات زندہ ضرور ہیں مگر انھیں اپنے ہونے کا شعور نہیں ہے۔ یہ شعور صرف انسانوں میں ہے۔ لہٰذا وجود رکھنے کا مطلب وجود کا شعور ہے۔"(4)

مندرجہ بالا اقتباس میں ژاں پال سارتر کا ماننا ہے کہ اس کائنات میں وجود تو ہر کوئی رکھتا ہے لیکن وہ اپنے وجود کو بیان نہیں کر پاتا۔ ایسا وجود جس میں اپنے آپ کو بیان کرنے سکت نہیں اور اس میں شعور نہیں ہے تو وہ وجود مردہ تصور ہو گا، اس کا شمار زندوں میں نہیں ہو گا۔ ان تمام تعریفوں کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ خالد جاوید کے ناول "موت کی کتاب" اور انیس ناگی کے ناول "دیوار کے پیچھے" میں وجودی فلسفے کو کردار و کہانی کے ذریعے کس طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ مضمون انھی دو ناولوں میں موجود وجودی فلسفے پر بحث کرتا ہے۔

اس موضوع کا پہلا ناول "دیوار کے پیچھے" ہے۔ جس کے مصنف "انیس ناگی" نے بھی وجودیت کے عناصر کو باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ جہاں تک وجودی فلسفیوں کا نقطہ نظر ہے تو ان کے نزدیک موت زندگی کے ساتھ ہی ظاہر ہوتی ہے جو انسان پیدا ہوا ہے اسے ہر حال میں مرنا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو وجودی ناولوں میں زیادہ تر مصنف حقیقت پر مبنی کہانیوں کو بیان کرتے ہیں۔ جس میں کہانی کا مرکزی کردار اپنی زندگی کی ناچاکیوں سے تنگ آ کر یا تو موت کا انتخاب کرتا ہے یا پھر بغاوت کر کے اپنا آپ تلاشنے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ تاہم دونوں ہی صورتوں میں موت ایک اٹل فیصلہ بنتا ہے۔

انیس ناگی کی بیشتر تحریروں میں ہمیں سارتر، البیر کامیو اور فرانز کافکا کے افکار اور نظریات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ ان کے ناول "دیوار کے پیچھے" میں بھی وجودی صورتحال کا عکس ملتا ہے۔ انیس ناگی کا ناول "دیوار کے پیچھے" کسی ایک انسان کی داستان نہیں بلکہ پوری انسانیت کا المیہ ہے۔

اس کائنات میں بہت سے ایسے سوال پوشیدہ ہیں جن کے جواب بظاہر ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی ظاہر نہیں ہوتے۔ فلاسفر انھی سوالات کے تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ان رموز سے پردہ اٹھایا جائے جو کہ چھپے ہوئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انیس ناگی بھی اپنے ناول "دیوار کے پیچھے" میں وجودی فلسفے پر سوال اٹھاتا ہے اور ان پر جواب بھی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ بڑا سوال جو کہ انیس ناگی کے ناول میں ہمیں نظر آتا ہے وہ وجودیت ہے۔ وجودی فلسفے پر لکھنے والا لکھاری اسی سوال کا متلاشی ہے کہ وجودیت کیا ہے؟ فرد اپنی شناخت کس طریقے سے حاصل کر سکتا ہے؟ کیا تمام افراد جو کہ وجودیت کے حامی ہے یا اپنا وجود تلاش کرتے ہیں ان کا موت استقبال کرتی ہے جب کہ دوسرے لفظوں میں اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ موت زندگی کے ساتھ ہی پیدا ہوتی ہے ۔ تو فلسفہ وجودیت یا فرد کا وجود کس اہمیت کا حامل ہے؟ اور اس کی شناخت کیوں کر ممکن ہے؟

"یہ راستہ ختم کیوں نہیں ہوتا میں باغ کے دوسرے کنارے پر ٹمٹماتی ہوئی روشنیوں کی طرف آگے بڑھ رہا ہوں مگر وہ دور ہی دور ہوتی جا رہی ہے۔ عام حالات میں یہ گزر گاہ بہت جلدی ختم ہو جایا کرتی تھی اور اب۔۔۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا حماقت ہے۔"(5)

"دیوار کے کے پیچھے" کا مرکزی کردار ایک ایسے لامتناہی سفر کا راہی ہے جہاں پر شاید منزل اس سے کوسوں دور ہے۔ جس پر وہ اپنی شناخت کے لیے در بدر پھر رہا ہے۔ ٹمٹماتی روشنی دراصل ایک امید پیہم کی روشنی ہے۔ ایسی روشنی جو کہ اپنے ہی رنگ میں رنگ کر اب بجھتی جا رہی ہے۔ بلاشبہ روشنی ایک امید کا استعارہ ہے لیکن یہاں پر وہ بھی بجھنے کی منتظر ہے۔ ایک ناامیدی اور مایوسی ہے جو کہ اسے اندھیرے راستوں کا مسافر بنا رہی ہے۔ مصنف نے ایک امید کی بات بھی کی ہے ساتھ ہی مایوسی اور ناامیدی جو کہ وجودی عناصر میں شامل ہیں اس کی بھی بات بھی کی ہے۔ انیس ناگی اپنے ناولوں میں ذہنی کشمکش کے ذریعے تخلیقی راستوں کی طرف نکلتے ہیں جس میں انسان اپنی ذات کا محتاج نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں اصل مسئلہ ہر اس تجربے کی معنوی حیثیت کا ہے جس تک پہنچتے ہوئے وہ اپنا وجود تلاش کرتا ہے یا پھر اپنے وجود کو تلاش کرنے کی کوشش میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے۔

"میں گزشتہ دنوں سے اپنے کمرے کی حراست میں ہوں، نہ جانے کمرے سے باہر دن کس طرح گزرا ہو گا، میں گھٹنوں سر دے کر یہی سوچتا رہا کہ میں کچھ سوچنے والا ہوں لیکن اس کے باوجود کچھ نہیں سوچ سکا۔ کمرے کی روشندان میں چڑیا کی چونچ میں زیتون کی سبز ٹہنی سنہری ہو چکی تھی، میں نے چڑیا کو فاختہ سمجھ کر ہاتھ کی لکیریں دیکھیں، ہاتھ کی لکیریں چلتی چلتی شہر کی سڑکوں سے جا ملیں، یقین ہو گیا کہ آغاز سفر ہے، سفر میں قسمت ہے اس لیے یہ ناگزیر ہے، اس کا انجام مجھے اور لکیروں دونوں کو پتہ نہیں ہے۔ دن اور رات کھلے میدان کی طرح میرے سامنے ہیں۔"(6)

تنہائی، بے معنویت اور آزادی انتخاب ایسے عناصر ہیں جو کہ وجودی فلسفے میں بیان کی اساس ہیں۔ اس اقتباس میں انھی کیفیات کو بڑی خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ کمرے کی اسیری کو بطور حراست استعمال کیا گیا ہے جس کی معنویت قاری پر اس طور عیاں ہوتی ہے کہ انسان بعض اوقات اپنے داخل کا مجرم بن کر خودکشی جیسے عمل سے بھی نہیں ڈرتا۔ انیس ناگی اپنی تحریروں میں خاص طور پر اپنے ناول "دیوار کے پیچھے" میں اپنی شناخت کا تعارف تو کروانا چاہتے ہیں لیکن زندگی کے

مسائل کا تعین ان کے آڑے آجاتا ہے۔ زندگی کا وہ سفر جو کہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے اسے بلا خوف و جھجک اپنی رائے کی آزادی اور اپنی شناخت کو منوانا چاہتا ہے۔

> "میں اپنا حساب خود بے باک کر لوں گا۔۔۔ میں بہت تھک گیا ہوں غالبا میرے اعصاب کو کیفین کی ضرورت ہے، میں نادانستہ طور پر اس ریسٹورنٹ کے سامنے آگیا ہوں جو بقول مردمان میری تباہی کا باعث بنا ہے۔ یہیں سے میرا تعاقب شروع ہوا تھا۔"(7)

اس لایعنی دنیا میں کون سا ایسا سوال ہے جس کا جواب موجود نہیں۔ ہر وہ سوال جو جواب سے محروم ہے ان تمام سوالات کا ذکر وجودی فلسفہ کے حامل افراد کرتے ہیں۔ انہی سوالوں میں ایک بڑا سوال جو ہمیں نظر آتا ہے وہ فرد کی شناخت ہے انیس ناگی بھی اپنے ناول میں فرد کی شناخت کا سوال اٹھاتے ہیں لیکن اس کا انجام پھر بھی موت ہی ہے۔ انیس ناگی کے ناول " دیوار کے پیچھے " اور خالد جاوید کا ناول "موت کی کتاب" بھی وجودی عناصر کا تخلیقی اظہار معلوم ہوتا ہے۔

خالد جاوید کا شمار عصرِ حاضر کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ناول کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام پیدا کیا۔ ان کی بیشتر تحریروں میں وجودی عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ناول "موت کی کتاب" میں بھی وجودی عناصر جابجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ایسا ناول ہے جس میں وہ ایک ایسے شخص کو متعارف کروانا چاہتے ہیں جو کہ جسمانی اور ذہنی اپاہج شخص ہے جسے لوگ حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اکیلا ہے اور درد میں گھرا رہتا ہے وہ اپنے وجود کی شناخت کے لیے کوشاں ہے۔ اس ناول کا کردار اپنی ذات کے لیے بھی ایسا ہوتا ہے جیسا کہ کوئی اجنبی ہو۔ وہ ایک غیر یقینی فضاء میں سانس لیتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنے ارد گرد کی فضاء سے کہیں دور چلا جائے۔ اپنے وجود کی تلاش میں وہ کئی بار خودکشی جیسا فعل سے بھی روگردانی نہیں کرتا۔

> "موت کی کتاب میں خالد جاوید نے معاصر سماج میں ہونے والے روحانی خلاء کو موضوع بنایا ہے۔ یہ خلاء اجتماعی بھی ہے اور انفرادی بھی۔ یہ خلاء انسان کے ہر اس عمل کے خلاف جدوجہد ہے جو اس کے مزاج کی متصادم نظر آتا ہے۔ فرد اور سماج کے اندر یہ خلاء وجودیت کو ظاہر کرتا ہے۔ موت کی کتاب کے متکلم کو تخلیق کرتے ہوئے خالد جاوید کے سامنے اکیسویں صدی کا سماج موجود ہے۔ اس سماج کے منظرنامے میں وہ وجودی شناخت کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ " (8)

ناول "موت کی کتاب" اپنے اسلوب اور منفرد انداز فکر کے اعتبار سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس ناول میں وجودی فلسفے کے کم و بیش سبھی علاقے اور مظاہر تخلیقی سطح پر مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں موت، خودکشی، نفرت کے جذبات، زندگی سے بیزاری کو بیان کیا گیا ہے۔

نشاط الثانیہ کے بعد جب یورپ میں علم، فن، سائنس کی روشنی پھیلی تو انسان نے عقل و شعور کے دروازے کھول دیئے۔ مگر اس روشن دور کے بعد ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب انسان اپنی ہی تخلیقات کا غلام بننے لگا۔ سائنسی ترقی اور انقلاب نے جہاں آسائشیں پیدا کیں وہیں پر بربریت جنگ و جدل اور استحصال کے نئے باب بھی کھول دیئے۔ طاقت اور مادی ترقی کی دوڑ میں اخلاقی اقدار کمزور پڑ گئیں۔ نو آبادیاتی نظام، دو عالمی جنگیں، ایٹم بم کی ایجاد اور سرمایہ دارانہ حرص نے انسان کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا۔ یوں نشاط ثانیہ کی روشن فکری کے بعد ایک ایسا عہد شروع ہوا جس میں انسان نے علم کا استعمال بھلائی کے بجائے تباہی کے لیے کیا اور انسانی تاریخ ایک بار پھر ظلم، جبر اور بربریت کے اندھیروں میں ڈوبتی نظر آئی۔ گویا دنیا میں موجود انسانیت کا قتل، ناامیدی، مایوسی اور لایعنیت انسان کو موت کے اندھیروں میں دھکیل دیتے ہیں۔ اس ناول کا کردار بھی ایسے افراد کی طرح ہے جو احساس کمتری یا احساس برتری کا شکار ہوتے ہیں وہ آہستہ آہستہ اس دنیا کی حقیقت سے اکتا جاتے ہیں جو ان کو قبول کرنے سے انکاری ہو۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت انجانے خیالوں میں پاتا ہے اور وہ ہمہ وقت اپنے آپ کو ختم کرنے کی سعی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

> "اس کمرے کے باہر برآمدے میں میرا باپ چین سے خراٹے لیتے ہوئے سو رہا ہے اور دوسری طرف برابر والے کمرے میں میری بیوی بھی بستر پر کروٹیں بدل رہی ہو گی۔ مگر میں یہاں اکیلا نہیں ہوں میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے ازل سے ہی میرے پیچھے لگا ہوا۔ میرے ساتھ کون ہے؟ خودکشی۔۔۔ہاں یقیناوہی ہے"۔(9)

مندرجہ بالا اقتباس میں دیکھا جائے تو مصنف نے ظاہری طور پر ایک عام سے حالات کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ لیکن مرکزی کردار کے داخل میں موجود انتشار کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ خارجی دنیا کی عام زندگی بھی اس کے اس انتشار کو ختم نہیں کر پاتی۔ وہ خلفشار سے بچنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود ہے۔ اس کو اس سے فرار کا راستہ صرف خودکشی میں نظر آتا ہے۔ خودکشی کا یہ خیال اس کو صرف وقتی طور پر نہیں آتا بلکہ ازل سے ہی اس کے ساتھ ہے۔ ناول موت کی کتاب کو پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ازل سے ہی موت اس کے تعاقب میں رہتی ہے

اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اسے اپنی طرف بلانے کی کوشش میں لگاتار مصروف عمل رہتی ہے۔ اس کو لگتا ہے کہ موت ہی ہر مسئلے کا یقینی حل ہے لہذا وہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے خودکشی یا موت کو گلے لگانے کی ناکام کوششیں کرتا رہتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ انسان نے ترقی کر کے اپنے ارد گرد اور خاص طور پر اپنی ذات کے لیے بہت سی آسانیاں پیدا کر لی ہیں، لڑائیاں بھی لڑی ہیں۔ لیکن وہ موت کو ٹالنے کا کوئی طریقہ ایجاد نہ کر سکا۔ موت کے سامنے انسان اور سائنس دونوں بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کو اپنے کوچ کر جانے کے وقت کا بھی علم نہیں۔ انسان اپنے سامنے ہی اپنے وجود کے مٹ جانے کو صدق دل سے تسلیم کرتا ہے لیکن موت کب آئے گی یہ وہ نہیں جانتا۔

اس ناول میں مرکزی کردار خود اپنی جان کے درپے ہے اسے اپنی ذات سے گھن محسوس ہوتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں موجود لوگوں کی بھیڑ سے دور جانا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کی بھیڑ سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی اولین اور آخری ترجیح موت ہی رہتی ہے۔ کیونکہ مایوسی دکھ اور پریشانی سے نجات اور اپنی زندگی سے بیزاری کا شکار ہونے والا یہ مرکزی کردار موت کو ہی آخری حل سمجھتا ہے۔

> "یہاں موجود انسان کی بھیڑ، ان کا جمع غفیر، رشتے، طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافیاں، جنگ و جدل، محبتیں، نفرتیں، دہشت گردیاں، سیاسی اور سماجی بے ہمواریاں اور نہ جانے کیا کیا الم، غلم۔ یہ سب ازل سے ویران کرہ ارض پر کسی دوسرے سیارے کے انسانوں کے دیکھے گئے خواب ہیں۔ ہزاروں سال سے اس دنیا کو بہتر بنانے کے لیے بڑی کوششیں کی جا رہی ہیں، ان کی حقیقت ہواؤں میں جھول کی تصویروں پر خنجر بازی کے ایک شوق کے سوا کچھ بھی نہیں۔"(10)

مجموعی طور پر ناول "موت کی کتاب" کے مطالعے سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ انسانی وجود خود ہی اپنے ختم ہو جانے کی اذیت کو سہتا ہے۔ موت کا آنا ایک اٹل حقیقت ہے ہر انسان کی موت کا تجربہ دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے وجودیت پر اصرار کرنے والا اس ناول کا مرکزی کردار بھی موت کو گلے لگانا بہتر سمجھتا ہے۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تصور خوش فہم اور مایوسیت رنج و الم تمام طرح کے نظریات پر انحصار کرتا ہے۔ اس تمام تقسیم کے پیچھے وہ فلسفے موجود ہیں جو مذہبی اور غیر مذہبی دونوں طرح کے اقتدار کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن موت کب آئے گی؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اس ناول کا

مرکزی کردار اپنے وجود کی تلاش میں گھومتا ہوا پھر اسی موت کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے وہ اپنی احساس کمتری اور احساس برتری کے سبب اپنا وجود تلاش کرنے میں قاصر ہے۔

> "اس مایوس اور واہیات زمین پر صرف تمہارا تنفس ہی تو ہے اور تمہارے پھیپھڑے ہی تو ہیں جو نہ صرف جیے جانے کا جواز پیش کرتے ہیں بلکہ دنیا کی بے شرمی کا مقابلہ ایک زیادہ بڑی بے شرمی کے ساتھ کرتے ہیں۔"(11)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالد جاوید نے مایوسی اور دنیا کی بے معنویت کو بڑی خوب صورتی سے علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس زندگی کو مایوسی سے علامت دی ہے۔ جب کسی فرد میں زندگی جینے کا مقصد ختم ہو جاتا ہے وہ اس دنیا سے اکتا جاتا ہے تب اس دنیا میں وہ صرف ظاہری طور پر سانس تو لے رہا ہوتا ہے لیکن جینے کا مقصد کہیں پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار بھی اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ اس دینا میں کیا کرنے آیا ہے۔ اور آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ بلاشبہ ان کے ناول کا اسلوب خاصا پیچیدہ اور مشکل ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فلسفے کی زبان تو مشکل ہی ہوتی ہے۔ جب کسی ناول میں میں کسی خاص نظریے یا فلسفے کو بیان کرنا مقصود ہو تو زبان خود بخود مشکل ہو جاتی ہے۔

دنیا کے مختلف طبقہ فکر کی طرح اردو ادب میں بھی تقابل کا رجحان خاصا دیکھنے کو ملتا ہے۔ تقابل کیوں کیا جاتا ہے؟ تقابل یا موازنے سے ہم دو مختلف متن اور ادبی تحریروں کا ایک دوسرے کی فکری رجحانات کو سامنے رکھ کر جائزہ لینے کی سعی کرتے ہیں۔ تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ آیا دونوں متون ایک ہی فکری تسلسل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں یا ان میں کوئی مماثلت موجود ہے۔ اس مضمون میں بھی تقابل کے ذریعے یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خالد جاوید اور انیس ناگی نے اپنے ناولوں میں وجودی فکر اور فلسفے کو کس طرح سے پیش کیا ہے۔

اگر ہم خالد جاوید کے ناول، موت کی کتاب" کے پلاٹ کو دیکھیں تو یہ ایک ایسے انسان کی کہانی ہے جو اپنی زندگی سے تنگ ہے اور موت کی بھیک مانگتا ہے۔ اس ناول کا موضوع ہی دراصل موت ہے اور اس کا مرکزی کردار بھی موت کا خواہش مند نظر آتا ہے۔ جب کہ انیس ناگی کا ناول "دیوار کے پیچھے "کا موضوع بظاہر موت تو نہیں لیکن اس کا انجام بھی موت کے جیسا ہی ہوتا ہے۔ اس میں مرکزی کردار اپنی شناخت کے لیے دربدر بھٹکتا ہے۔ اگر ہم ان دونوں ناولوں کا تقابل کریں تو ہمیں دونوں ناولوں میں ایک ہی چیز دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ کہ دونوں ناولوں میں مرکزی کردار اپنی شناخت کی تلاش میں ہے۔

یہ وہ شناخت ہے جو انسان کے وجود کے ساتھ قائم ہوئی اور یہ تبھی ختم ہوتی ہے جب انسان موت کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ دونوں ہی ناولوں میں وجودیت کی چھاپ نظر آتی ہے جس میں ایک ایسا کمزور انسان دکھایا گیا ہے جو ناخود کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے فیصلے پر سوچ بچار کر سکتا ہے۔ ان کے احساسات اور جذبات منفی اثرات کے زیر اثر رہتے ہیں جو کہ ان میں غصہ، نفرت اور کرب کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ تمام احساسات ایسے ہیں جنہیں وہ مثبت طریقے سے اپنے وجود کی شناخت کے ساتھ تسلیم کرنا چاہتے ہیں لیکن انہیں بحیثیت انسان یہ اختیار نہیں دیا گیا یا معاشرے میں رہنے والے اعلی اقتدار کے حامل لوگ انہیں ان کی شناخت تک پہنچنے نہیں دیتے جس کے سبب ان کو آخری حل موت ہی دکھائی دیتا ہے۔

دراصل وجودیت کے فلسفے میں جسم کو اہمیت حاصل ہے۔ انسان کے اندر پلنے والا ایک اور انسان جسے ہم ہمزاد سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا انسان ہے جو بظاہر چلنے پھرنے والا گوشت پوست کا انسان تو نظر آتا ہے لیکن اس کے اندر پلنے والا ایک اور انسان جسے اپنی شناخت کی تلاش ہے۔ جب کوئی انسان جیتے جاگتے اپنی ہی موت کا شدت سے انتظار کرتا ہے تو ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سوال کئی ایک مزید سوالوں کو جنم دیتا ہے۔ جس میں ہمیں جواب ایک ہی ملتا ہے کہ انسان کے اندر کی مایوسی نا امیدی اور کرب کی کیفیت جو اسے اپنا آپ منوانے اور دنیا میں اپنی شناخت کے ساتھ جینے میں مدد نہیں کرتی تو انسان اپنے ہی ساتھ بغاوت شروع کر دیتا ہے اور موت کی نیند سو جاتا ہے۔

جب بات فلسفہ وجودیت پر ہوتی ہے تو اس کا انحصار انسان کی ذات پر بھی ہے اسی طرح ان دونوں ناولوں "موت کی کتاب" اور "دیوار کے پیچھے" فلسفہ وجودیت کے تحت دو مرکزی کردار اپنی اپنی شناخت اور اس جسم کی شناخت، جو جیتا جاگتا تو نظر آتا ہے لیکن اس کی کوئی پہچان نہیں وہ اپنی پہچان کو ڈھونڈنے کے سبب دنیا سے بغاوت کرتا ہے لیکن اس بغاوت کا ایک ہی حل نکلتا ہے جو کہ موت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

1. سورین کرکیگارڈ،Concluding Uncientific Poscrxpt،(نیویارک: کیمبرج یونی ورسٹی پریس2009ء) ص183
2. جے اے کوڈن،ڈکشنری آف لٹریری ٹرم اینڈ لٹریری تھیوریز،(انگلینڈ: ہیومنگن،1994ء)ص36
3. احسان اشرف،وجودیت کا فلسفہ،(پٹنہ: نیو کوالیٹی آفسیٹ شاہ گنج،2010ء) ص8
4. قاضی جاوید،"میں وجودی نہیں ہوں"،سارتر کے مضامین،مرتبہ فہیم شناس کاظمی(کراچی: سٹی بک پوائنٹ،۲۰۱۵ء)ص 27
5. انیس ناگی،دیوار کے پیچھے،(لاہور: قوسین پبلشرز،1983ء)ص16
6. ایضاً،ص30-31
7. ایضاً،ص38
8. ندا بتول، خالد جاوید کے ناولوں میں وجودی عناصر(سرگودھا: (مقالہ برائے ایم فل اردو، سرگودھا یونی ورسٹی، 2025ء)ص11
9. خالد جاوید،موت کی کتاب،فلیپ،(کراچی: سٹی بک پوائنٹ،۲۰۲۱ء)ص25
10. ایضاً،ص27
11. ایضاً،ص35-36